نقش فریادی

فیض احمد فیض

پتہ

شفیق بک ڈپو اردو بازار جامع مسجد دہلی

تعداد :- پانچسو

قیمت :- چار روپے

طابع :- نعمانی پریس دہلی

ملنے کا پتہ

شفیق بک ڈپو اردو بازار جامع مسجد دہلی

فہرست

....

دیباچہ

اس مجموعہ کی اشاعت ایک طرح کا اعترافِ شکست ہے۔ شاید اس میں دو
چار نظمیں قابلِ برداشت ہوں۔ لیکن نظموں کو کتابی صورت میں طبع کروانا ممکن نہیں۔
اصولاً مجھے جبتک انتظار کرنا چاہیے تھا۔ کہ ایسی نظمیں کافی تعداد میں جمع ہو جائیں۔ لیکن یہ
انتظار کچھ عبث معلوم ہونے لگا ہے۔ شعر لکھنا جرم نہ سہی۔ لیکن بے وجہ شعر لکھتے رہنا
ایسی دانشمندی بھی نہیں۔ آج سے کچھ برس پہلے ایک معیّن جذبہ کے زیر اثر اشعار خود بخود
وارد ہوتے تھے۔ لیکن اب مضامین کے لیے تجسّس کرنا پڑتا ہے۔ علاوہ ازیں ان نوجوانی
کے تجربات کی جڑیں بہت گہری نہیں ہوتیں۔ ہر تجربہ زندگی کے بقیہ نظام سے الگ کیا
جا سکتا ہے۔ اور ایک کیمیاوی مرکب کی طرح اس کی ہر ہیئت مطالعہ کی جا سکتی ہے
اس منفرد اور معیّن تجربہ کے لیے کوئی موزوں پیرایہ وضع یا اختیار کر لینا بھی آسان ہے
لیکن اب یہ تمام عمل مشکل بھی دکھائی دیتا ہے، اور بیکار بھی، اول تو تجربات ایسے خلط ملط
ہو گئے ہیں۔ کہ انہیں علیحدہ علیحدہ ٹکڑوں میں تقسیم کرنا مشکل ہے۔ پھر ان کی پیچیدگی
کو دیانتداری سے ادا کرنے کے لیے کوئی تسلّی بخش پیرایۂ بیان نہیں ملتا۔ میں جانتا ہوں۔ کہ یہ
تجربات کا قصور نہیں شاعر کے ذہن کا عجز ہے۔ ایک کامل اور قادر الکلام شاعر کی طبیعت
ان مشکلات کو آسانی سے سر کر لیتی ہے۔ اسے یا اظہار کے نئے اسالیب ہاتھ آجاتے ہیں
یا وہ پرانے اسالیب کو کھینچ تان کر اپنے مطالب پر موزوں کر لیتی ہے۔ لیکن ایسے شعراء
کی تعداد بہت محدود ہے۔ ہم میں سے بیشتر کی شاعری کسی داخلی یا خارجی تحرک کی دست
نگر رہتی ہے اور اگر ان محرکات کی شدت میں کمی واقع ہو جائے۔ یا ان کے اظہار کے لیے
کوئی سہل راستہ پیش نظر نہ ہو تو تجربات کو مسخ کرنا پڑتا ہے۔ یا طریق اظہار کو، ذوق
اور مصلحت کا یہی ہے۔ کہ ایسی صورتِ حال پیدا ہونے سے پہلے شاعر کو جو کچھ کہنا ہو

کہہ چکے - اہلِ محفل کا شکریہ ادا کرے - اور اجازت چاہے -

اس مجموعے میں نظموں کی ترتیب کم و بیش وہی ہے جس میں لکھی گئی ہیں۔ پہلے حصے میں طالب علمی کے زمانہ کی نظمیں ہیں۔ انہیں حذف نہ کرنے کی تجارتی وجہ شروع میں عرض کر چکا ہے۔ نفسیاتی وجہ یہ ہے۔ کہ ان نظموں میں جس کیفیت کی ترجمانی کی گئی ہے وہ اپنی سطحیت کے باوجود عالمگیر ہے - ایک خاص عمر میں ہر کوئی یہی کچھ محسوس کرتا ہے اور اسی انداز سے سوچتا ہے۔ لیکن عام طور پر ان تجربات کا خلوص تمام عمر قائم نہیں رہتا۔ کچھ عرصہ کے بعد انسان اپنی ذات کو مرکزِ دو عالم سمجھنا چھوڑ دیتا ہے اور اسے عالمگیر ظلم اور بے انصافی کے پیشِ نظر اپنی ذرا ذرا سی ناکامیاں بے حقیقت دکھائی دینے لگتی ہیں۔ اب اسے تجربات کی نئی تراکیب اور اظہار کے نئے ذرائع مولے تلاش کرنے پڑتے ہیں۔ اور یہی وہ وقت ہے۔ جس کی طرف میں پہلے اشارہ کر چکا ہوں۔

بہر حال ارتکاب گناہ کے بعد معذرت بیکار سی چیز ہے۔ اور ہر مصنف کا حق ہے۔ کہ اگر وہ چاہے تو اسے مطلق نظر انداز کر دے۔

ان نظموں میں میں نے روایتی اسالیب سے غیر ضروری انحراف مناسب نہیں سمجھا۔ بحور میں کہیں کہیں بہت ہلکا سا تصرف ہے۔ اور قوافی میں دو ایک جگہ صوتی مناسبت کو لفظی صحت پر ترجیح دی گئی ہے۔ اور بس۔ میں اپنے احباب صوفی تبسم مجید ملک اور نعیم خاں کا ممنون ہوں۔ کہ انھوں نے مسودات کی تصحیح اور ترتیب میں امداد فرمائی۔ مقدمہ کے لیے ن۔ م راشد اور سرورق کے لیے مشفقِ محترم خاں بہادر عبدالرحمٰن چغتائی کا میں خاص طور سے شکر گزار ہوں۔

فیض

دیباچہ (طبع ثانی)

اس مجموعہ کا پہلا ایڈیشن خلافِ توقع، بہت جلد ختم ہو گیا۔ ممنون ہوں۔ پبلشر کا کہنا ہے۔ کہ دوسرے ایڈیشن کے تقاضے موصول ہو رہے ہیں۔ "دروغ بر گردنِ راوی"۔ میں چاہتا ہوں کہ دوسرا اس مدت تک روکے رکھوں۔ جب تک پہلے ایڈیشن کا کافی قطع و برید کی گنجائش نکل سکے۔ لیکن پبلشر کہتے ہیں۔ کہ یہ تعویق ان کے تجارتی مفاد کے منافی ہے۔ مجبوراً میں نے چار پانچ نسبتہً زیادہ قابل اعتراض نظمیں حذف کرنے پر اکتفا کی ہے اور قریباً اتنی ہی نظمیں بڑھا دی ہیں۔

فیض

مقدمہ

"نقشِ فریادی" ایک ایسے شاعر کی غزلوں اور نظموں کا پہلا مجموعہ ہے جو
رومان اور حقیقت کے سنگم پر کھڑا ہے۔ اس کی سرشت نوا سے عشق کے ساتھ
ہم آہنگ ہونے پر اکساتی ہے۔ لیکن وہ حقیقت کے روزن میں سے زندگی کی
برہنگی اور تلخی پر نظر ڈال لینے کی ترغیب کو روک نہیں سکے۔

ادبی ذوق کا کوئی انقلاب اپنی ہیئت اور نتائج کے اعتبار سے اتنا وسیع
اور اتنا شدید نہ ہوگا۔ جتنا ہمارے زمانے میں جمہور کے خیالات، احساسات اور
عزائم کی بڑھتی ہوئی رَو نے پیدا کیا ہے۔ خود ہمارے ملک میں جہاں عوام کی بیداری
کا ابھی آغاز ہے۔ غزل اور اس کے ساتھ اشراف کی دل پسندی شاعری۔ جسے وہ
اپنے خلافِ فطرت ہیجانات کی تسکین کا ذریعہ سمجھتے تھے۔ آخری ہچکیاں لے رہی
ہیں۔ ایک عرصہ سے یہ تصور رائج چلا آرہا ہے۔ کہ شاعری محض تفریح اور دل لگی
کا سامان ہے۔ حالی۔ اکبر۔ اور اقبال نے اس نظریے پر سب سے پہلے ضرب
لگائی۔ لیکن اس کی جگہ جو نظریہ انھوں نے رائج کرنا چاہا۔ اس کا مفہوم یہ
تھا۔ کہ شاعری صرف قوموں اور گروہوں کی اخلاقی زندگی سدھارنے کا
ذریعہ ہے۔ جاریار شاعری نہ تو شاعری کو محض عیاشوں کی تفریح کا سامان
قرار دیتے ہیں۔ اور نہ اسے بگڑی ہوئی قوموں کا سستا اور سہل الحصول ہدایت
نامہ۔ شاعری ان کے نزدیک ہماری زندگی کے لیے محض تفریح سے زیادہ
اہمیت اور کہیں گہرا مفہوم رکھتی ہے۔ وہ اس کے تفریحی پہلو کے منکر نہیں۔ لیکن
انسانی زندگی اور ہماری روزانہ سرگرمیوں پر اس کے خاموش مگر عمیق اثر کے
بھی قائل ہیں۔

فیض نے ابتدا غزل گو کی حیثیت سے کی۔ اس نے غزل کو محض صنفِ سخن

کی حیثیت سے ہی اختیار کیا۔ بلکہ اس میں تھوڑی سی تازگی اور شگفتگی کا اضافہ کرکے اس کی قدیم اور روایتی علامات اور تصورات کو برقرار رکھا۔ اس کی غزلیں بہت حد تک قدیم شاعروں کے خیالات ہی کی بازگشت ہیں۔ جیسے کہ ہر اچھی غزل کو ہونا چاہیے۔ اپنی ابتدائی نظموں میں فیضؔ ایک بورژا، حسن پرست اور انحطاط کا دلدادہ شاعر نظر آتا ہے۔ خود مجھ پہ اور غالباً ہماری پود کے اکثر شاعروں پر ایسا ہی زمانہ گزرا ہے۔ ہم میں سے بعض اس دلدل سے جلد باہر نکل آئے ہیں۔ اور بعض ابھی تک اسی کے اندر ہاتھ پیر مار رہے ہیں۔ فیضؔ کی اس زمانے کی نظمیں حریری گلابی ملبوسوں میں لپٹی ہوئی خواب سے چُور اور لذت سے سرشار تصویروں سے بھری پڑی ہیں۔ زندگی سے ان کا براہِ راست کوئی تعلق نہیں۔ زندگی میں اور ان میں ایک خلیج حائل ہے۔ ذاتی حسن پرستی کی خلیج، جسے فیضؔ عرصے تک پار نہیں کر سکا۔ "انتہائے کار"، "انجام" اور "سرودِ شبانہ" اس نوع کی نظمیں ہیں۔ ان نظموں میں شاعر خود اپنے ساتھ سرگوشیاں کرتا سنائی دیتا ہے۔ "تنہائی" میں یہی سرگوشیاں زیادہ پُراسرار، زیادہ فریب انگیز ہو گئی ہیں۔ ان نظموں کے مصرعے رینگ رینگ کر چلتے ہوئے محسوس ہوتے ہیں۔ نظموں کا تار پود مکڑی کے جالے سے زیادہ استوار اور بکار آمد نہیں۔ ہر ہر لفظ پر احساسات ایک بوجھ، ایک کابوس بن کر چھائے ہوئے ہیں۔ اس زمانے میں فیضؔ نے جو بحر (فاعلاتن مفاعلن فعلن) سب سے زیادہ استعمال کی ہے۔ وہ تمام بحروں سے زیادہ کاہل، نرم رَو اور خواب آلود ہے۔

گزشتہ چند سالوں سے فیضؔ کی شاعری میں حیرت انگیز تبدیلی نظر آتی ہے۔ اس کی آخری نظمیں مثلاً "مجھ سے پہلی سی محبت مری محبوب نہ مانگ"، "موضوعِ سخن"، "انتباہ" اور "تسلی"، وغیرہ اس جسمانی اور ذہنی کشاکش کا پتہ دیتی ہیں جس میں ہماری پود مبتلا ہے۔ یہ نہیں کہ فیضؔ نے عمداً رومان پرستی کو خیرباد کہہ کر نام نہاد ترقی

پسندراستہ اختیار کر لیا ہے۔ بلکہ یوں محسوس ہوتا ہے۔ جیسے خیالات کی پختگی کے ساتھ ساتھ وہ غلطاں غلطاں احساسات کی نئی دنیا میں چلا گیا ہے۔ جہاں سائے زیادہ گہرے اور زمین زیادہ سنگلاخ ہے۔ فیض زیادہ شروع سے ان چیزوں کا دلدادہ رہا ہے جن کو اس کے حواس براہِ راست دیکھ سکتے ہیں۔ سن سکتے اور چھو سکتے ہوں۔ لیکن وہ زندگی کے حسین اور رقت انگیز پہلو کے سامنے ہمیشہ ذکی الحس رہا ہے۔ اس کا متخیلہ اس کی ذات کے گرد اس کے اپنے ماضی، اپنے مستقبل کے گرد گھومتا رہا ہے۔ طبیعت کی افتاد نے غالباً اسے مرئی حُسن سے ہٹا کر مرئی بار صورتی میں سے لذت اخذ کرنے کی طرف مائل کر دیا ہے اب اس کے تاثرات محض ہوا کے جھونکوں کی طرح اس کے جسم کو چھوڑ کر نہیں گزر جاتے بلکہ اس کے سینے میں جاگزیں ہو کر دیر تک غم اور غصہ کی لہروں کو بھڑاتے رہتے ہیں، اس کی بحروں میں بھی تبدیلی آتی چلی گئی ہے۔ اب وہ فاعلاتن۔ فعلاتن فعلن اور فعول فعولن فعلاتن وغیرہ قسم کی زیادہ سبک، زیادہ متحرک اور زیادہ تند بحروں کا دلدادہ ہے۔ اب اس کی تصویریں محض آئینہ خانے کے عکس نہیں۔ بلکہ ایک ہاری ہوئی لُٹی ہوئی تہذیب کے نئے سرے سے جنم لیتے ہوئے مجسمے ہیں۔ جو ہاتھ پھیلا کر پھیلا کر اپنی حیاتِ نو کے خوابوں کی طرف بڑھنے کی کوشش کر رہے ہیں۔

فیض عمداً روایت کا باغی شاعر نہیں۔ اس کے ہاں قاتل اور رقیب کی سی فرسودہ علامات بھی نظر آتی ہیں۔ اس نے بحروں اور قافیوں اور ہیئتِ سخن میں قابلِ ذکر تبدیلی نہیں کی۔ لیکن اس کی انفرادیت اس قدر نمایاں ہے کہ اس کی شاعری قدیم شاعری سے بالکل علیحدہ، بالکل مختلف نظر آتی ہے۔ ہمارے قدیم شاعر دراصل حسن کے احساس سے بہت حد تک بے بہرہ تھے۔ وہ اپنی جنسی الجھنوں میں اس قدر گرفتار تھے۔ کہ حسن ان کے لیے فی الواقع ایک نہایت سطحی اور ناقابلِ توجہ چیز تھی۔ انھوں نے یوں تو انسانی جسم کے حُسن کی تعریف میں زمین و آسمان کی تعریف

میں قلابے ملا دئے۔ لیکن حسن کے نازک، لطیف اور دلدوز احساسات تک ان کی رسائی نہ ہو سکی۔ انھوں نے روائتی علامات اور تشبیہات پر بیشتر خلوصِ اظہار کو قربان کیا۔ تجزیہ کرنے سے ہمارے قدیم شاعر کی دنیا بے حد زشت اور کرخت نظر آتی ہے
یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ عہدِ حاضر کے نوجوان شاعروں میں سے فیض ہی تنہا شاعر ہے۔ جس کے ہاں جنسی الجھنوں کے آثار سب سے کم ملتے ہیں۔ فیض اپنے تصورات سے اپنے لیے خالص حسن کا ایک دلکش بہشت پیدا کرنا چاہتا ہے۔ خمارِ خواب سے لبریز احمریں آنکھیں، رخساروں کے عشرت آلود غازے، سرخ ہونٹوں پر تبسم کی ضیا، مرمریں ہاتھوں کی لرزشیں، مخملیں باہیں۔ رنگین پیراہن، دہکتے ہوئے رخسار اور جھلکتے ہوئے آنچل اس دنیا میں بار بار آتے ہیں۔ اور وہ انہیں الفاظ کے مجموعے سے ایک حسینۂ خیال کا مجسمہ تعمیر کر دیتا ہے۔ پھر اس حسینہ کو کسی نیم تاریک، نیم خواب شبستان میں بٹھا کر اس سے اپنا انتظار کراتا ہے۔ اس کے لبوں پر دعائیں اور التجائیں چسپاں کراتا ہے۔ اس کی نگاہوں کی ناصبوری پر رحم کھاتا ہے۔ اس کی تھکاوٹ، اس کی اداسی اور اس کی تنہائی کے بوجھ سے چُور جوانی سے لذت کا اکتساب کرتا ہے۔ خود اس کے قریب دبے پاؤں آ آ کر ہٹ جاتا ہے۔ تاکہ وہ طلسم جس کے ریشمی تاروں سے یہ دنیا آویزاں ہے۔ دفعتاً ٹوٹ جاتی ہے۔ فیض کی ابتدائی شاعری اس طلسمی حقیقت سے گریز کی داستاں ہے۔ اس کے مطمحِ نظر اور حقیقت کے درمیان ہمیشہ ایک خلیج سی حائل رہتی ہے۔ جسے وہ عبور کرتے ہوئے جھجکتا اور کانپتا ہے۔
لیکن وہ اس خلیج کو پاٹنے میں بالکل ناکام بھی نہیں رہا۔ اُس نے حسن اور رومان کے سنہری پردوں کے اس پار حقیقت کی ایک جھلک دیکھ لی ہے۔ اس نے آرزوؤں کے مقتل، بھوک اگانے والے کھیت خاک

میں لتھڑے اور خون میں نہائے ہوئے جسم، بازاروں میں بکتا ہوا مزدور کا گوشت ناتوانوں کے نوالوں پر جھپٹتے ہوئے عقاب دیکھ پائے ہیں۔ دلوں کی بے سود تڑپ اور جسموں کی مایوس پکارسن پائی ہے۔ اجنبی ہاتھوں کے بے نام ستم کی گرانباری محسوس کر پائی ہے۔ ناسوروں سے بہتی ہوئی پیپ کی بدبو سونگھ لی ہے۔ دہکتے ہوئے شہروں کی فراواں مخلوق کی حسرتِ مرگ کا جائزہ کر لیا ہے حقیقت کی اس بے نقابی پر اس کی بعض نظموں میں جذبات کا سیلاب پھوٹ پڑا ہے۔ فیضؔ میں غیظ و غضب کی فراوانی اور تندی نہیں۔ وہ اپنے جذبات کی بے پناہ شدت کا شکار نہیں ہوتا۔ اسے جذبات کے خلوص کے ساتھ خود ضبطی کا وہ جوہر عطا ہوا ہے۔ جو اس کے غصّے کو ایسا شعلہ نہیں بننے دیتا جو بھڑک کر خاموش ہو جائے۔ بلکہ جذبات کی ایک دبی ہوئی چنگاری کہیں آہستہ آہستہ سلگتی رہتی ہے۔ اس خود ضبطی کے طفیل وہ اپنی نظم (تسلّی) میں اپنے غصّے کو بہتر دنیا کے مخملی خواب میں چھپا دینے میں کامیاب ہو گیا ہے۔

"عرصۂ دہر کی جھلسی ہوئی ویرانی میں
ہم کو رہنا ہے پہ یونہی تو نہیں رہنا ہے
اجنبی ہاتھوں کا بے نام گرانبار ستم
آج سہنا ہے ہمیشہ تو نہیں سہنا ہے"

چنانچہ اپنی فن کاری کے اس خاص حربے سے وہ غم و غصّے کی انتہا کو بھی پاس کا طوفان نہیں بننے دیتا۔ وہ عہدِ جدید کی "شیطنت" کو ضرور عریاں کرتا ہے کیونکہ اس کا تخیّل مری حقیقتوں رُو در رُو ہو کر ان پر طعن کرنے پر مجبور ہے۔ لیکن وہ ان حقیقتوں کو خواب میں منتقل کر کے انہیں حسن کی پوشاک پہنانا جانتا ہے۔ اس خواب آفرینی کا نتیجہ ہے کہ اس کی نظموں کے

بعض ٹکڑے سخت گھناونے ہونے کے باوجود دل کش ہوتے ہیں۔ وہ عہدِ حاضر کے عفریت کے سینے میں اپنا تیر گاڑتا ہے۔ لیکن زیادہ گہرا نہیں۔ اتنا گہرا نہیں، کہ وہ ایک سسکی لیے بغیر چل بسے۔ وہ حقیقت کے دل تک پہنچنا چاہتا ہے۔ لیکن اس دل بر مانے سے کنیاتا ہے۔ اسی لیے اس کی بعض نظموں میں حقیقت کے نفرت آلود چہرے پر غازے کی چمک باقی رہ جاتی ہے۔ وہ غنائیت اور تغزل کی صورت میں نمودار ہوکر ہے۔ اسے عہدِ حاضر کی عالم گیر شیطنت سے وحشت اور کراہت ہے۔ لیکن اس وحشت اور کراہت کو ایک دم تباہ کرنا اسے منظور نہیں معصیت کے دُور تک پھیلے ہوئے جالوں اور ظلم کی بے پناہ زنجیروں کا خیال اسے بیتاب رکھتا ہے۔ جو ایک انسان کے جسم پر نہیں، دس انسانوں کے جسم پر نہیں۔ بلکہ ساری انسانی دنیا کو ایک کنارے سے دوسرے کنارے تک جکڑے ہوئی ہیں۔

"تو گر میری بھی ہو جائے
دنیا کے غم یونہی رہیں گے
پاپ کے پھندے ظلم کے بندھن
اپنے کہے سے کٹ نہ سکیں گے"

یا

بول کہ لب آزاد ہیں تیرے
بول زباں اب تک تیری ہے
بول یہ تھوڑا وقت بہت ہے
جسم و زباں کی موت سے پہلے
بول کہ سچ زندہ ہے اب تک
بول جو کچھ کہنا ہے کہ لے"

احساس کی تلخی ان اشعار میں اپنی پوری شدت پر ہے۔ یہاں تک کہ فیض کے ذہن میں بسی ہوئی موسیقی بھی اس تلخی کو مٹا کر ان الفاظ کو خالی تغزل میں تبدیل کرنے کی ہمت نہیں رکھتی۔

اس تلخی میں بے صبری بلکہ خفقان وہ اثر پایا جاتا ہے۔ جو ہمارے زمانے کا طرۂ امتیاز ہے۔ فیض غالباً ہمارے تمام موجودہ شاعروں سے بڑھ کر تاریخ کی بے پناہ قوتوں کا شعور رکھتا ہے۔ اس لیے کبھی تو وہ اس چار طرف چھائی ہوئی شیطنت اور ناانصافی کا مجرم اجنبی ہاتھوں کے ستم کو قرار دیتا ہے۔ کبھی ان گنت صدیوں کے تاریک بہیمانہ طلسم میں اس کا راز تلاش کرتا ہے۔ اور کبھی اسے اجداد کی میراث سمجھ کر بے بسی کی حالت میں خاموش ہو جاتا ہے۔ فیض کی یہ آخری زمانے کی شاعری میرے نزدیک اس نفسی الجھن کی بہترین مثال ہے۔ جسے ..... (OEDIPUS-COMPLEX) کہتے ہیں۔ یہ الجھن شاید ہم سب میں ہے اور عہدِ حاضر کے جس شاعر میں نہیں۔ وہ اپنے اردگرد کے سماجی، اقتصادی اور سیاسی انقلاب سے بے بہرہ ہے۔ ہماری موجودہ تہذیب ماضی کی روایت سے اس قدر بیگانہ اور اس سے اس قدر مختلف ہوتی جا رہی ہے۔ کہ ہم اپنے دکھوں کو اپنے اجداد کی میراث سمجھنے پر مجبور ہیں۔ اس میں کوئی مبالغہ نہیں۔ جب عشق کسی خیالی صورت کی دریوزہ گری کرنا اپنی توہین سمجھتا ہے۔ جب وہ ظلم سہتے ہوئے اور پائندہ غلامی میں کراہتے ہوئے انسانوں کو اپنی آغوش میں لینا چاہتا ہو تو رقیب یا تو "اجنبی" ہے۔ یا ان گنت صدیاں ہیں۔ یا پھر ہمارے بدنصیب اجداد!

لیکن فیض کی نظم کا موضوع خواہ کوئی رومان ہو۔ خواہ زندگی کی سنگین حقیقت اس کا طریق کار اس کی تکنیک ہر جگہ ایک سی رہتی ہے۔ اور برسوں میں بھی اس میں کوئی زیادہ نمایاں تبدیلی واقع نہیں ہوتی۔ فیض ہمارے زمانے کے بعض دوسرے

شاعروں کی طرح تشبیہات کا دلدادہ نہیں۔ اگر آپ اس کی نظموں کو غور سے دیکھیں تو شاذ ہی آپ کو کوئی تشبیہ ملے گی۔ کہیں بھی وہ کسی لفظ کا مفہوم سمجھانے یا کسی چیز کی تصویر پیش کرنے کے لیے کوئی اس سے بڑھ کر انجانی اور نامعلوم چیز اپنے قاری کے سامنے پیش نہیں کرتا۔ وہ صرف ایسے الفاظ کا انتخاب کرتا ہے۔ جو مل کر ناثر کے تاروں میں ایک شدید لیکن پائدار لرزش پیدا کر دیں۔ اس نے اپنی بعض ابتدائی نظموں مثلاً "تہ نجوم"، "ایک منظر" اور "سرودِ شبانہ" میں اسی قسم کی کاریگری سے کام لیا ہے۔ لیکن اس کی نظم "تنہائی" اس نوع کی صناعی کی غالباً بہترین مثال ہے۔

پھر کوئی آیا دلِ زار نہیں کوئی نہیں
رہرو ہوگا کہیں اور چلا جائے گا!
ڈھل چکی رات بکھرنے لگا تاروں کا غبار
لڑکھڑانے لگے ایوانوں میں خوابیدہ چراغ
سو گئی راہ تک تک کے ہر اک راہ گزر
اجنبی خاک نے دھندلا دیے قدموں کے سراغ
گل کرو شمعیں بڑھا دو مے و مینا و ایاغ
اپنے بے خواب کواڑوں کو مقفّل کر لو
اب یہاں کوئی نہیں آئے گا"

مجھے بارہا خیال آیا ہے۔ کہ شاید یہ نظم بھی کسی سیاسیات میں الجھے ہوئے لمحے کی پیداوار ہو۔ کیا راہرو سے مراد کوئی نیا حملہ آور ہے؟ کیا تاروں کا ڈھلتا ہوا غبار اور ایوانوں میں لڑکھڑاتے ہوئے چراغ ہماری تہذیب اور مذہب کے بکھرے ہوئے شیرازے کی طرف اشارہ کرتے ہیں؟ اور کیا اجنبی خاک میں

قدموں کے سراغوں کے دھندلا جانے سے شاعر کا یہ مطلب ہے۔ کہ اس سرزمین
نے جہاں ہم صدیوں پہلے ایک ہنگامہ، ایک ہاؤ ہو لے کر آئے تھے۔ آج اپنی
ناگوار آب وہوا اور اپنے ناپسندیدہ ماحول سے ہمیں زوال آمادہ قوم بنادیا
ہے؟ لیکن شاید اس حسین اور انتہا درجے کی اثر آفریں نظم پر یہ الزام لگانا
اسے مجروح کرنا ہوگا۔ اس نظم کی کامیابی تو اس کی مجرد تاثیر ہی میں مضمر ہے
اس نظم کی پشت پر شاعر کے ایک بے مایاں ذہنی تجربے کا پتہ چلتا ہے۔ جس
کی ذکی الحس شخص کو اپنی زندگی میں کبھی کوئی اُداس اور غمناک بسر کرنے کا تجربہ
ہوا ہے۔ اسے اگر اس نظم کے مطالعے سے تنہائی کا بوجھ ایک سنگ گراں
کے مانند اپنے کندھوں، اپنے جسم بلکہ اپنے سارے وجود پر محسوس ہونے لگے
تو یہ نظم یقیناً ایک بہت بڑی تخلیق ہے۔ فیضؔ کسی مرکزی نظریے کا شاعر نہیں
صرف احساسات کا شاعر ہے۔ اور اپنے شدید احساسات کو وہ اپنے حسین
الفاظ کے ساتھ اس طرح پیوست کرتا ہے۔ کہ وہ ایک ہی پیرہن کے تار و
پود معلوم ہونے لگتے ہیں۔

ن۔ م راشد

دہلی۔ ۱۵ر نومبر ۱۹۴۱ء

بروائے عقل و منہ منطق و حکمت در پیش
کہ مرا نسخہ غمہائے فلاں در پیش است

عرفی

اشعار

رات یوں دل میں تری کھوئی ہوئی یاد آئی
جیسے ویرانے میں چپکے سے بہار آجائے
جیسے صحراؤں میں ہولے سے چلے بادِ نسیم
جیسے بیمار کو بے وجہ قرار آجائے

۲

دل رہینِ غمِ جہاں ہے آج
ہر نفس تشنۂ فغاں ہے آج
سخت ویراں ہے محفلِ ہستی
اے غمِ دوست تُو کہاں ہے آج

خدا وہ وقت نہ لائے ......

خدا وہ وقت نہ لائے کہ سوگوار ہو تُو
سکوں کی نیند تجھے بھی حرام ہو جائے
تری مسرّت پیہم تمام ہو جائے
تری حیات تجھے تلخ جام ہو جائے
غموں سے آئینۂ دل گداز ہو تیرا
ہجومِ یاس سے بیتاب ہو کے رہ جائے
وفورِ درد سے سیماب ہو کے رہ جائے
ترا شباب فقط خواب ہو کے رہ جائے
غرورِ حُسن سراپا نیاز ہو تیرا

طویل راتوں میں تُو بھی قرار کو ترسے
تری نگاہ کسی غمگسار کو ترسے
خزاں رسیدہ تمنّا بہار کو ترسے
کوئی جبیں نہ ترے سنگِ آستاں پہ جھکے
کہ جنسِ عجز و عقیدت سے تجھکو شاد کرے
فریبِ وعدۂ فردا پہ اعتماد کرے
خدا وہ وقت نہ لائے کہ تجھ کو یاد آئے

وہ دل کہ تیرے لیے بیقرار اب بھی ہے
وہ آنکھ جس کو ترا انتظار اب بھی ہے

....

غزل

حُسن مرہونِ جوشِ بادۂ ناز
عشق منت کشِ فسونِ نیاز

دل کا ہر تار لرزشِ پیہم
جاں کا ہر رشتہ وقفِ سوز و گداز

سوزشِ دردِ دل کسے معلوم
کون جانے کسی کے عشق کا راز

میری خاموشیوں میں لرزاں ہے
میرے نالوں کی گمشدہ آواز

ہو چکا عشق اب ہوس ہی سہی
کیا کریں فرض ہے ادائے نماز

تو ہے اور اِک تغافلِ پیہم
میں ہوں اور انتظارِ بے انداز

خوفِ ناکامیِ امید ہے فیضؔ
ورنہ دل توڑ دے طلسمِ مجاز

انتہائے کار

پندار کے خوگر کو
ناکام بھی دیکھو گے؟
آغاز سے واقف ہو
انجام بھی دیکھو گے

رنگینئ دنیا سے مایوس سا ہو جانا
دُکھتا ہوا دل لے کر تنہائی میں کھو جانا
ترسی ہوئی نظروں کو
حسرت سے جُھکا لینا
فریاد کے ٹکڑوں کو
آہوں میں چُھپا لینا

راتوں کی خموشی میں چُھپ کر کبھی رو لینا
مجبور جوانی کے ملبوس کو دھو لینا

جذبات کی وسعت کو
سجدوں سے بسا لینا
بھُولی ہوئی یادوں کو سینے سے لگا لینا

....

میں دل فگار نہیں تُو ستم شعار نہیں
بہت دنوں سے مجھے تیرا انتظار نہیں
ترا ہی عکس ہے اُن اجنبی بہاروں میں
جو ترے لب، ترے بازو، ترا کنار نہیں

....

انجام

ہیں لبریز آہوں سے ٹھنڈی ہوائیں
اُداسی میں ڈوبی ہوئی ہیں گھٹائیں
محبت کی دنیا پہ شام آچکی ہے
سیہ پوش ہیں زندگی کی نگاہیں

....

مچلتی ہیں سینے میں لاکھ آرزوئیں
تڑپتی ہیں آنکھوں میں لاکھ التجائیں

تغافل کے آغوش میں سو رہے ہیں

تمہارے ستم اور میری وفائیں -

مگر پھر بھی اے میرے معصوم قاتل -

تمہیں پیار کرتی ہیں میری دعائیں

٭..........٭
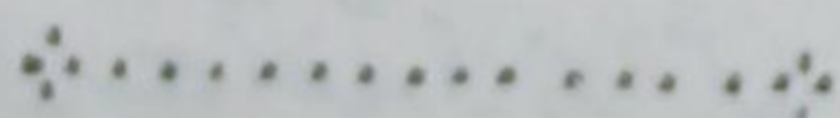
ادائے حُسن کی معصومیت کو کم کردے -

گناہ گارِ نظر کو حجاب آتا ہے

سرودِ شبانہ

گم ہے اک کیف میں فضائے حیات
خامشی سجدۂ نیاز میں ہے
حسنِ معصوم خوابِ ناز میں ہے

....

اے کہ تو رنگ و بو کا طوفاں ہے
اے کہ تو جلوہ گر بہار میں ہے
زندگی تیرے اختیار میں ہے
پھول لاکھوں برس نہیں رہتے
دو گھڑی اور ہے بہارِ شباب

آ کچھ دل کی سن سنا لیں ہم
آ محبت کے گیت گا لیں ہم

....

میری تنہائیوں پہ شام رہے؟
حسرتِ دید ناتمام رہے؟

دل میں بیتاب ہے صدائے حیات
آنکھ گوہر نثار کرتی ہے
آسماں پر اُداس ہیں تارے
چاندنی انتظار کرتی ہے
آ کہ تھوڑا سا پیار کر لیں ہم
زندگی زرنگار کر لیں ہم

:.............:

غزل

عشق منت کشِ قرار نہیں
حُسن مجبورِ انتظار نہیں

تیری رنجش کی انتہا معلوم
حسرتوں کا مری شمار نہیں

اپنی نظریں بکھیر دے ساقی
مے باندازہ خمار نہیں

زیرِ لب ہے ابھی تبسم دوست
منتشر جلوۂ بہار نہیں

اپنی تکمیل کر رہا ہوں میں
ورنہ تجھ سے بھی مجھ کو پیار نہیں

چارۂ انتظار کون کرے
تیری نفرت بھی استوار نہیں

فیضؔ زندہ رہیں وہ ہیں تو سہی
کیا ہوا گر وفا شعار نہیں

آخری خط

وہ وقت مری جاں بہت دور نہیں ہے
جب درد سے رک جائینگی سب زیست کی راہیں
اور حد سے گزر جائے گا اندوہِ نہانی
تھک جائیں تر ستی ہوئی ناکام نگاہیں
چھن جائیں گے مجھ سے مرے آنسو مری آہیں
چھن جائے گی مجھ سے مری بیکار جوانی

شاید مری الفت کو بہت یاد کرو گی
اپنے دلِ معصوم کو ناشاد کرو گی
آؤ گی مری گور پہ تم اشک بہانے
نوخیز بہاروں کے حسیں پھول چڑھانے

....

شاید مری تربت کو کبھی ٹھکرا کے چلو گی
شاید مری بیسود وفاؤں پہ ہنسو گی
اس وضع کرم کا بھی تمہیں پاس نہ ہو گا
لیکن دلِ ناکام کو احساس نہ ہو گا

القصہ مآلِ غمِ الفت پہ ہنسو تم
یا اشک بہاتی رہو فریاد کرو تم
ماضی پہ ندامت ہو تمہیں یا کہ مسرت
خاموش پڑا سوئے گا واماندۂ الفت

....

غزل

ہر حقیقت مجاز ہو جائے
کافروں کی نماز ہو جائے

دل رہینِ نیاز ہو جائے
بیکسی کارساز ہو جائے

منتِ چارہ ساز کون کرے؟
دردجب جاں نواز ہو جائے

عشق دل میں رہے تو رسوا ہو
لب پہ آئے تو راز ہو جائے

لطف کا انتظار کرتا ہوں
جور تا حدِ ناز ہو جائے

عمر بے سود کٹ رہی ہے فیضؔ
کاش افشائے راز ہو جائے

حسینۂ خیال سے
مجھے دیدے

رسیلے ہونٹ، معصومانہ پیشانی، حسیں آنکھیں
کہ میں اک بار پھر رنگینیوں میں غرق ہو جاؤں
مری ہستی کو تیری اک نظر آغوش میں لے لے
ہمیشہ کے لیے اس دام میں محفوظ ہو جاؤں
ضیاءِ حُسن سے ظلماتِ دنیا میں نہ پھر آؤں

گزشتہ حسرتوں کے داغ میرے دل سے دھل جائیں

میں آنے والے غم کی فکر سے آزاد ہو جاؤں

مرے ماضی و مستقبل سراسر محو ہو جائیں

مجھے وہ اک نظر، اک جاودانی سی نظر دیدے

(براؤننگ

....

مری جاں اب بھی اپنا حُسن.....

مری جاں اب بھی اپنا حسن واپس پھیر دے مجھ کو

ابھی تک دل میں تیرے عشق کی قندیل روشن ہے

ترے جلووں سے بزمِ زندگی جنت بداماں ہے

مری رُوح اب بھی تنہائی میں تجھ کو یاد کرتی ہے

ہر اک تارِ نفس میں آرزو بیدار ہے اب بھی

ہر اک بے رنگ ساعت منتظر ہے تیری آمد کی

نگاہیں بجھ رہی ہیں راستہ زرکار ہے اب بھی

مگر جانِ حزیں صدمے سہے گی آخرش کب تک؟

تری بے مہریوں پہ جان دے گی آخرش کب تک؟

تری آواز میں سوئی ہوئی شیرینیاں آخر

مرے دل کی فسردہ خلوتوں میں جا نہ پائیں گی

یہ اشکوں کی فراوانی سے دھندلائی ہوئی آنکھیں

تری رعنائیوں کی تمکنت کو بھول جائیں گی

پکاریں گے تجھے تو لب کوئی لذّت نہ پائیں گے

گلو میں تیری الفت کے ترانے سوکھ جائیں گے

مبادا یادہائے عہدِ ماضی محو ہو جائیں

یہ پارینہ فسانے موجہائے غم میں کھو جائیں

مرے دل کی تہوں سے تیری صورت ڈھل کے بہ جائے
حریم عشق کی شمع درخشاں بجھ کے رہ جائے
مبادا اجنبی دنیا کی ظلمت گھیر لے تجھ کو
مری جاں اب بھی اپنا حسن واپس پھیر دے مجھ کو!

....

MR
M
O
H
D
S
H
A
R
Q
9697776801

بعد از وقت

دل کو احساس سے دوچار نہ کر دینا تھا
سازِ خوابیدہ کو بیدار نہ کر دینا تھا

اپنے معصوم تبسم کی فراوانی کو
وسعتِ دید پہ گلنار نہ کر دینا تھا

شوقِ مجبور کو بس ایک جھلک دکھلا کر
واقفِ لذتِ تکرار نہ کر دینا تھا

چشمِ مشتاق کی خاموش تمناؤں کو
یک بیک مائلِ گفتار نہ کر دینا تھا

جلوۂ حسن کو مستور ہی اب رہنے دے
حسرتِ دل کو گنہگار نہ کر دینا تھا

سرودِ شبانہ

نیم شب، چاند، خود فراموشی
محفلِ ہست و بود ویراں ہے
پیکرِ التجا ہے خاموشی
بزمِ انجم فسردہ ساماں ہے
آبشارِ سکوت جاری ہے

چار سو بے خودی سی طاری ہے
زندگی جزوِ خواب ہے گویا!
ساری دنیا سراب ہے گویا!

سو رہی ہے گھنے درختوں پر
چاندنی کی تھکی ہوئی آواز
کہکشاں نیم وا نگاہوں سے
کہہ رہی ہے حدیثِ شوقِ نیاز
سازِ دل کے خموش تاروں سے!
چھن رہا ہے خمارِ کیف آگیں
آرزو، خواب، تیرا روئے حسیں!

....

اشعار

وہ عہدِ غم کی کاہشہائے بے حاصل کو کیا سمجھے
جو اِن کی مختصر روداد بھی صبر آزما سمجھے

یہاں وابستگی، واں برہمی، کیا جانیے کیوں ہے؟
نہ ہم اپنی نظر سمجھے نہ ہم اُن کی ادا سمجھے

فریبِ آرزو کی سہل انگاری نہیں جاتی
ہم اپنے دل کی دھڑکن کو تری آوازِ پا سمجھے

تمہاری ہر نظر سے منسلک ہے رشتۂ ہستی
مگر یہ دُور کی باتیں کوئی نادان کیا سمجھے

نہ پوچھو عہدِ اُلفت کی، بس اک خوابِ پریشاں تھا
نہ دل کو راہ پر لائے نہ دل کا مدعا سمجھے

....

قطعات

وقفِ حرمان و یاس رہتا ہے　　دل ہے اکثر اداس رہتا ہے
تم تو غم دے کے بھول جاتے ہو　　مجھ کو احساں کا پاس رہتا ہے

....

فضائے دل پہ اُداسی بکھرتی جاتی ہے
فسردگی ہے کہ جاں تک اترتی جاتی ہے
فریبِ زیست سے قدرت کا مدّعا معلوم
یہ ہوش ہے کہ جوانی گزرتی جاتی ہے

انتظار

گزر رہے ہیں شب و روز تم نہیں آتیں

ریاضِ زیست ہے آزردہ دہ بہار ابھی

مرے خیال کی دنیا ہے سوگوار ابھی

جو حسرتیں ترے غم کی کفیل ہیں پیاری

ابھی تلک مری تنہائیوں میں بستی ہیں

طویل راتیں ابھی تک طویل ہیں پیاری

اُداس آنکھیں ابھی انتظار کرتی ہیں

بہارِ حسن، یہ پابندئ جفا کب تک؟
یہ آزمائشِ صبرِ گریز پا کب تک؟

قسم تمہاری بہت غم اٹھا چکا ہوں میں
غلط تھا دعوئ صبر و شکیب آ جاؤ
قرارِ خاطرِ بے تاب تھک گیا ہوں میں

....

تہِ نجوم

تہِ نجوم، کہیں چاندنی کے دامن میں
ہجومِ شوق سے اک دل ہے بیقرار ابھی
خمارِ خواب سے لبریز احمریں آنکھیں
سفید رخ پہ پریشان عنبریں آنکھیں
چھلک رہی ہے جوانی ہر اک بنِ مُو سے
رواں ہو برگِ گلِ تر سے جیسے سیلِ شمیم

ضیاءِ مہ میں دمکتا ہے رنگِ پیراہن

ادائے عجز سے آنچل اڑا رہی ہے نسیم

دراز قد کی لچک سے گداز پیدا ہے

ادائے ناز سے رنگِ نیاز پیدا ہے

اُداس آنکھوں میں خاموش التجائیں ہیں

دلِ حزیں میں کئی جاں بلب دعائیں ہیں

تہِ نجوم کہیں چاندنی کے دامن میں

کسی کا حسن ہے مصروفِ انتظار ابھی

کہیں خیال کے آباد کردہ گلشن میں

ہے ایک گل کہ ہے ناواقفِ بہار ابھی

....

حُسن اور موت

جو پھول سارے گلستاں میں سب سے اچھا ہو
فروغِ نور رہو جس سے فضائے رنگیں میں
خزاں کے جور وستم کو نہ جس نے دیکھا ہو
بہار نے جسے خونِ جگر سے پالا ہو
وہ ایک پھول سماتا ہے چشمِ گل چیں میں

....

ہزار پھولوں سے آباد باغِ ہستی ہے
اجل کی آنکھ فقط ایک کو ترستی ہے
کئی دلوں کی امیدوں کا جو سہارا ہو
فضائے دہر کی آلودگی سے بالا ہو
جہاں میں آکے ابھی جس نے کچھ نہ دیکھا ہو
نہ قحطِ عیش و مسرت، نہ غم کی ارزانی
کنارِ رحمتِ حق میں اسے سلاتی ہے
سکوتِ شب میں فرشتوں کی مرثیہ خوانی
طواف کرنے کو صبحِ بہار آتی ہے
صبا چڑھانے کو جنت کے پھول لاتی ہے

....

تین منظر

تصوّر

شوخیاں مضطر نگاہِ دیدۂ سرشار میں
عشرتیں خوابیدہ رنگِ غازۂ رخسار میں
سرخ ہونٹوں پر تبسم کی ضیائیں جس طرح
یاسمن کے پھول ڈوبے ہوں مئے گلنار میں

....

سامنا

چھنتی ہوئی نظروں سے جذبات کی دنیائیں
بے خوابیاں، افسانے، مہتاب، تمنّائیں
کچھ الجھی ہوئی باتیں، کچھ بہکے ہوئے نغمے
کچھ اشک جو آنکھوں سے بے وجہ چھلک جائیں

رخصت

فسردہ رخ، لبوں پر اک نیاز آمیز خاموشی
تبسّم مضمحل تھا، مرمریں ہاتھوں میں لرزش تھی
وہ کیسی بے کسی تھی تیری پُر تمکیں نگاہوں میں
وہ کیا دُکھ تھا تری سہمی ہوئی خاموش آہوں میں

سرود

موت اپنی، نہ عمل اپنا، نہ جینا اپنا
کھو گیا شورشِ گیتی میں قرینہ اپنا
ناخدا دور، ہوا تیز، قریں کامِ نہنگ
وقت ہے پھینک دے لہروں میں سفینہ اپنا
عرصۂ دہر کے ہنگامے تہِ خواب سہی
گرم رکھ آتشِ پیکار سے سینہ اپنا
ساقیا رنج نہ کر جاگ اُٹھے گی محفل
اور کچھ دیر اٹھا رکھتے ہیں پینا اپنا
بیش قیمت ہیں یہ غمہائے محبت مت بھول
ظلمتِ یاس کو مت سونپ خزینہ اپنا

یاس

بربطِ دل کے تار ٹوٹ گئے
ہیں زمیں بوس راحتوں کے محل
مٹ گئے قصّہ ہائے فکر و عمل
بزمِ ہستی کے جام چھوٹ گئے

چھن گیا کیفِ کوثر و تسنیم

زحمتِ گریہ و بکا بے سود
شکوۂ بختِ نارسا بے سود

ہو چکا ختم رحمتوں کا نزول
بند ہے مدتوں سے بابِ قبول
بے نیازِ دعا ہے ربِ کریم
بجھ گئی شمعِ آرزوئے جمیل یاد باقی ہے بے کسی کی دلیل
انتظارِ فضول رہنے دے
رازِ الفت نباہنے والے
بارِ غم سے کراہنے والے
کاوشِ بے حصول رہنے دے

....

آج کی رات

آج کی رات سازِ درد نہ چھیڑ

دُکھ سے بھرپور دن تمام ہوئے
اور کل کی خبر کسے معلوم؟

دوش و فردا کی مٹ چکی ہیں حدود
ہو نہ ہو اب سحر کسے معلوم؟

زندگی ہیچ! لیکن آج کی رات
ایزدیت ہے ممکن آج کی رات

آج کی رات سازِ درد نہ چھیڑ!

اب نہ دہرا فسانہائے الم — اپنی قسمت پہ سوگوار نہ ہو
فکرِ فردا اتار دے دل سے — عمرِ رفتہ پہ اشکبار نہ ہو

عہدِ غم کی حکایتیں مت پوچھ
ہو چکیں سب شکایتیں مت پوچھ

آج کی رات سازِ درد نہ چھیڑ!

....

غزل

ہمتِ التجا نہیں باقی
ضبط کا حوصلہ نہیں باقی

اک تری دید چھن گئی مجھ سے
ورنہ دنیا میں کیا نہیں باقی

اپنی مشقِ ستم سے ہاتھ نہ کھینچ
میں نہیں یا وفا نہیں باقی

تیری چشمِ الم نواز کی خیر
دل میں کوئی گلا نہیں باقی

ہو چکا ختم عہدِ ہجر و وصال
زندگی میں مزا نہیں باقی

ایک رہگزر پر

وہ جس کی دید میں لاکھوں مسرّتیں پنہاں
وہ حسن جس کی تمنّا میں جنتیں پنہاں
ہزار فتنے تہ پائے ناز، خاک نشیں
ہر اک نگاہ خمارِ شباب سے رنگیں
شباب، جس سے تخیّل پہ بجلیاں برسیں
وقار، جس کی رفاقت کو شوخیاں ترسیں
ادائے لغزشِ پا پر قیامتیں قرباں
بیاضِ رُخ پہ سحر کی صباحتیں قرباں

سیاہ زلفوں میں وارفتہ نکہتوں کا ہجوم
طویل راتوں کی خوابیدہ راحتوں کا ہجوم

وہ آنکھ جس کے بناؤ پہ خالق اِترائے
زبانِ شعر کو تعریف کرتے شرم آئے

وہ ہونٹ فیض سے جن کے بہار لالہ فروش
بہشت و کوثر و تسنیم و سلسبیل بدوش

گداز جسم، قبا جس پہ سج کے ناز کرے
دراز قد جسے سروِ سہی نماز کرے

غرض وہ حسن جو محتاجِ وصف و نام نہیں
وہ حُسن جس کا تصوّر بشر کا کام نہیں

کسی زمانے میں اس راہگذر سے گزرا تھا
بصد غرور و تجمل، ادھر سے گزرا تھا

اور اب یہ راہگذر بھی ہے دلفریب و حسیں
ہے اس کی خاک میں کیفِ شراب و شعر مکیں
ہوائیں شوخیٔ رفتار کی ادائیں ہیں
فضائیں نرمیٔ گفتار کی صدائیں ہیں
غرض وہ حسن اب اس جا کا جزوِ منظر ہے
نیازِ عشق کو اک سجدہ گہ میسّر ہے

.:. . . . .:.

غزل

چشمِ میگوں ذرا اِدھر کر دے
دستِ قدرت کو بے اثر کر دے

تیز ہے آج دردِ دل ساقی
تلخیٔ مے کو تیز تر کر دے

جوشِ وحشت ہے تشنہ کام ابھی
چاکِ دامن کو تا جگر کر دے

میری قسمت سے کھیلنے والے
مجھ کو قسمت سے بے خبر کر دے

لُٹ رہی ہے مری متاعِ نیاز
کاش وہ اس طرف نظر کر دے

فیضؔ تکمیلِ آرزو معلوم
ہو سکے تو یونہی بسر کر دے

بام و در خامشی کے بوجھ سے چُور
آسمانوں سے جوئے درد رواں

چاند کا دُکھ بھرا فسانۂ نُور
شاہراہوں کی خاک میں غلطاں

خواب گاہوں میں نیم تاریکی
مضمحل لے رباب ہستی کی

ہلکے ہلکے سُروں میں نوحہ کناں

میرے ندیم ......

خیال و شعر کی دنیا میں جان تھی جن سے
فضائے فکر و عمل ارغوان تھی جن سے
وہ جن کے نور سے شاداب تھے مہ و انجم
جنونِ عشق کی ہمت جوان تھی جن سے
وہ آرزوئیں کہاں سو گئی ہیں میرے ندیم؟

....

وہ ناصبور نگاہیں، وہ منتظر راہیں
وہ پاسِ ضبط سے دل میں دبی ہوئی آہیں
وہ انتظار کی راتیں، طویل، تیرہ و تار
وہ نیم خواب شبستاں، وہ مخملیں باہیں
کہانیاں تھیں کہیں کھو گئی ہیں، میرے ندیم!

مچل رہا ہے رگِ زندگی میں خونِ بہار
اُلجھ رہے ہیں پرانے غموں سے روح کے تار
چلو کہ چل کے چراغاں کریں دیارِ حبیب
ہیں انتظار میں اگلی محبتوں کے مزار
محبتیں جو فنا ہو گئی ہیں، میرے ندیم!

....

۲

"دلے بفروختم جانے خریدم"

(نظامی)

مجھ سے پہلی سی محبت مری محبوب نہ مانگ

مجھ سے پہلی سی محبت مری محبوب نہ مانگ

میں نے سمجھا تھا کہ تُو ہے تو درخشاں ہے حیات
ترا غم ہے تو غمِ دہر کا جھگڑا کیا ہے؟
تیری صورت سے ہے عالم میں بہاروں کو ثبات
تیری آنکھوں کے سوا دنیا میں رکھا کیا ہے؟

تو جو مِل جائے تو تقدیر نگوں ہو جائے

یوں نہ تھا، میں نے فقط چاہا تھا یوں ہو جائے
اور بھی دُکھ ہیں زمانے میں محبت کے سوا
راحتیں اور بھی ہیں وصل کی راحت کے سوا
اَن گنت صدیوں کے تاریک بہیمانہ طلسم
ریشم و اطلس و کمخواب میں بنوائے ہوئے
جا بجا بکتے ہوئے کوچہ و بازار میں جسم
خاک میں لتھڑے ہوئے، خون میں نہلائے ہوئے

جسم نکلے ہوئے امراض کے تنّوروں سے
پیپ بہتی ہوئی گلتے ہوئے ناسوروں سے
لوٹ جاتی ہے ادھر کو بھی نظر کیا کیجیے؟

اب بھی دل کش ہے ترا حسن مگر کیا کیجے؟
اور بھی دُکھ ہیں زمانے میں محبت کے سوا
راحتیں اور بھی ہیں وصل کی راحت کے سوا
مجھ سے پہلی سی محبت مری محبوب نہ مانگ!

....
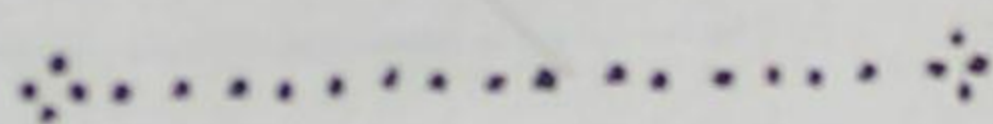
غزل

دونوں جہان تیری محبت میں ہار کے
وہ جا رہا ہے کوئی شبِ غم گزار کے

ویراں ہے میکدہ خم وساغر اداس ہیں
تم کیا گئے کہ روٹھ گئے دن بہار کے

اک فرصتِ گناہ ملی، وہ بھی چار دن
دیکھے ہیں ہم نے حوصلے پروردگار کے

دنیا نے تیری یاد سے بیگانہ کر دیا
تجھ سے بھی دلفریب ہیں غم روزگار کے

بھولے سے مسکرا تو دیے تھے وہ آج فیضؔ
مت پوچھ ولولے دلِ ناکردہ کار کے

سوچ

کیوں میرا دل شاد نہیں ہے کیوں خاموش رہا کرتا ہوں؟

چھوڑو میری رام کہانی میں جیسا بھی ہوں اچھا ہوں

میرا دل غمگیں ہے تو کیا غمگیں یہ دنیا ہے ساری
یہ دکھ تیرا ہے نہ میرا ہم سب کی جاگیر ہے پیاری

تو گر میری بھی ہو جائے دنیا کے غم یونہی رہیں گے
پاپ کے پھندے، ظلم کے بندھن اپنے کہے سے کٹ نہ سکیں گے

غم ہر حالت میں مہلک ہے اپنا ہو یا اور کسی کا
رونا دھونا، جی کو جلانا یوں بھی ہمارا، یوں بھی ہمارا

کیوں نہ جہاں کا غم اپنا لیں بعد میں سب تدبیریں سوچیں
بعد میں سکھ کے سپنے دیکھیں سپنوں کی تعبیریں سوچیں

بے فکرے دھن دولت والے یہ آخر کیوں خوش رہتے ہیں؟
ان کا سکھ آپس میں بانٹیں یہ بھی آخر ہم جیسے ہیں

ہم نے مانا جنگ کڑی ہے سر پھوٹیں گے، خون بہے گا
خون میں غم بھی بہ جائیں گے ہم نہ رہیں، غم بھی نہ رہے گا

غزل

وفائے وعدہ نہیں، وعدۂ دگر بھی نہیں
وہ مجھ سے روٹھے تو تھے، لیکن اسقدر بھی نہیں

برس رہی ہے حریمِ ہوس میں دولتِ حُسن
گدائے عشق کے کاسے میں اک نظر بھی نہیں

نہ جانے کس لیے امیدوار بیٹھا ہوں
اک ایسی راہ پہ جو تیری رہگزر بھی نہیں

نگاہِ شوق سرِ بزم بے حجاب نہ ہو
وہ بے خبر ہی سہی، اتنے بے خبر بھی نہیں

یہ عہدِ ترکِ محبت ہے کس لیے آخر
سکونِ قلب اِدھر بھی نہیں اُدھر بھی نہیں

⁘.........⁘
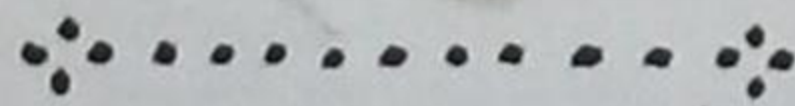
رقیب سے

آکہ وابستہ ہیں اس حسن کی یادیں تجھ سے
جس نے اس دل کو پری خانہ بنا رکھا تھا
جس کی الفت میں بُھلا رکھی تھی دنیا ہم نے
دہر کو دہر کا افسانہ بنا رکھا تھا
آشنا ہیں ترے قدموں سے وہ راہیں جن پر
اس کی مدہوش جوانی نے عنایت کی ہے

کارواں گزرے ہیں جن سے اسی رعنائی کے
جس کی اِن آنکھوں نے بے سود عبادت کی ہے

تجھ سے کھیلی ہیں وہ محبوب ہوائیں جن میں
اس کے ملبوس کی افسردہ مہک باقی ہے

تجھ پہ بھی برسا ہے اس بام سے مہتاب کا نور
جس میں بیتی ہوئی راتوں کی کسک باقی ہے

تو نے دیکھی ہے وہ پیشانی، وہ رخسار، وہ ہونٹ
زندگی جن کے تصور میں لٹا دی ہم نے

تجھ پہ اٹھی ہیں وہ کھوئی ہوئی ساحر آنکھیں
تجھ کو معلوم ہے کیوں عمر گنوا دی ہم نے

ہم پہ مشترکہ ہیں احسان غمِ الفت کے
اتنے احسان کہ گنواؤں تو گنوا نہ سکوں

ہم نے اس عشق میں کیا کھویا ہے کیا سیکھا ہے؟
جز ترے اور کو سمجھاؤں تو سمجھا نہ سکوں
عاجزی سیکھی، غریبوں کی حمایت سیکھی
یاس و حرمان کے، دکھ درد کے معنی سیکھے
زیر دستوں کے مصائب کو سمجھنا سیکھا
سرد آہوں کے، رُخِ زرد کے معنی سیکھے
جب کہیں بیٹھ کے روتے ہیں وہ بیکس جن کے
اشک آنکھوں میں بلکتے ہوئے سو جاتے ہیں
ناتوانوں کے نوالوں پہ جھپٹتے ہیں عقاب
بازو تولے ہوئے منڈلاتے ہوئے آتے ہیں
جب کبھی بکتا ہے بازار میں مزدور کا گوشت
شاہراہوں پہ غریبوں کا لہو بہتا ہے

یا کوئی توند کا بڑھتا ہوا سیلاب لیے
فاقہ مستوں کو ڈبونے کے لیے کہتا ہے!

آگ سی سینے میں رہ رہ کے ابلتی ہے نہ پوچھ
اپنے دل پر مجھے قابو ہی نہیں رہتا ہے

....

تنہائی

پھر کوئی آیا دلِ زار! نہیں کوئی نہیں!
راہرو ہو گا، کہیں اور چلا جائے گا
ڈھل چکی رات، بکھرنے لگا تاروں کا غبار
لڑکھڑانے لگے ایوانوں میں خوابیدہ چراغ
سو گئی راستہ تک تک کے ہر اک راہ گزر
اجنبی خاک نے دھندلا دئے قدموں کے سراغ
گل کرو شمعیں، بڑھا دو مے و مینا و ایاغ
اپنے بے خواب کواڑوں کو مقفّل کر لو
اب یہاں کوئی نہیں، کوئی نہیں آئے گا

....

غزل

رازِ الفت چھپا کے دیکھ لیا
دل بہت کچھ جلا کے دیکھ لیا

اور کیا دیکھنے کو باقی ہے
آپ سے دل لگا کے دیکھ لیا

آس اُس در سے ٹوٹتی ہی نہیں
جا کے دیکھا، نہ جا کے دیکھ لیا

وہ مرے ہو کے بھی مرے نہ ہوئے
ان کو اپنا بنا کے دیکھ لیا

آج ان کی نظر میں کچھ ہم نے
سب کی نظریں بچا کے دیکھ لیا

فیضؔ تکمیلِ غم بھی ہو نہ سکی
عشق کو آزما کے دیکھ لیا

غزل

کچھ دن سے انتظارِ سوالِ دگر میں ہے
وہ مضمحل حیا جو کسی کی نظر میں ہے

سیکھی یہیں مرے دلِ کافر نے بندگی
ربِّ کریم ہے تو تری رہ گزر میں ہے

ماضی میں جو مزا مری شام و سحر میں تھا
اب وہ فقط تصورِ شام و سحر میں ہے

کیا جانے کس گوس سے ہے اب روا کی طلب
وہ غم جو میرے دل میں ہے تیری نظر میں ہے

غزل

پھر حریفِ بہار ہو بیٹھے — جانے کس کس کو آج رو بیٹھے

تھی، مگر اتنی رائیگاں بھی نہ تھی — آج کچھ زندگی سے کھو بیٹھے

تیرے در تک پہنچ کے لوٹ آئے — عشق کی آبرو ڈبو بیٹھے

ساری دنیا سے دور ہو جائے — جو ذرا تیرے پاس ہو بیٹھے

نہ گئی تیری بے رُخی نہ گئی — ہم تری آرزو بھی کھو بیٹھے

فیضؔ ہوتا رہے جو ہونا ہے
شعر لکھتے رہا کرو بیٹھے

چند روز اور مری جان!

چند روز اور مری جان! فقط چند ہی روز
ظلم کی چھاؤں میں دم لینے پہ مجبور ہیں ہم!
اور کچھ دیر ستم سہہ لیں، تڑپ لیں، رولیں
اپنے اجداد کی میراث ہے معذور ہیں ہم
جسم پر قید ہے، جذبات پہ زنجیریں ہیں
فکر محبوس ہے، گفتار پہ تعزیریں ہیں
اپنی ہمت ہے کہ ہم پھر بھی جیے جاتے ہیں!
زندگی کیا کسی مفلس کی قبا ہے جس میں
ہر گھڑی درد کے پیوند لگے جاتے ہیں

لیکن اب ظلم کی میعاد کے دن تھوڑے ہیں
اک ذرا صبر، کہ فریاد کے دن تھوڑے ہیں

عرصۂ دہر کی جھلسی ہوئی ویرانی میں
ہم کو رہنا ہے پہ یونہی تو نہیں رہنا ہے
اجنبی ہاتھوں کا بے نام گراں بارِ ستم
آج سہنا ہے ہمیشہ تو نہیں سہنا ہے
یہ ترے حسن سے لپٹی ہوئی آلام کی گرد
اپنی دو روزہ جوانی کی شکستوں کا شمار
چاندنی راتوں کا بے کار دہکتا ہوا درد
دل کی بے سود تڑپ، جسم کی مایوس پکار
چند روز اور مری جان! فقط چند ہی روز

....

مرگِ سوزِ محبت

آؤ کہ مرگِ سوزِ محبت منائیں ہم
آؤ کہ حسنِ ماہ سے دل کو جلائیں ہم
خوش ہوں فراقِ قامت و رخسارِ یار سے
سرو و گل و سمن سے نظر کو ستائیں ہم
ویرانیِ حیات کو ویران تر کریں
لے ناصح آج تیرا کہا مان جائیں ہم
پھر اوٹ لے کے دامنِ ابرِ بہار کی
دل کو منائیں ہم کبھی آنسو بہائیں ہم

سلجھائیں بے دلی سے یہ الجھے ہوئے سوال
واں جائیں یا نہ جائیں، نہ جائیں کہ جائیں ہم
پھر دل کو پاسِ ضبط کی تلقین کر چکیں
اور امتحانِ ضبط سے پھر جی چرائیں ہم
آؤ کہ آج ختم ہوئی داستانِ عشق
اب ختم عاشقی کے فسانے سنائیں ہم

....

کُتّے

یہ گلیوں کے آوارہ بے کار کتے کہ بخشا گیا جن کو ذوقِ گدائی
زمانہ کی پھٹکار سرمایہ ان کا جہاں بھر کی دھتکار ان کی کمائی

نہ آرام شب کو، نہ راحت سویرے
غلاظت میں گھر، نالیوں میں بسیرے
جو بگڑیں تو اک دوسرے سے لڑا دو
ذرا ایک روٹی کا ٹکڑا دکھا دو

یہ ہر ایک کی ٹھوکریں کھانے والے
یہ فاقوں سے اُکتا کے مر جانے والے

یہ مظلوم مخلوق گر سر اٹھائے
تو انسان سب سرکشی بھول جائے
یہ چاہیں تو دنیا کو اپنا بنا لیں
یہ آقاؤں کی ہڈیاں تک چبا لیں
کوئی اِن کو احساسِ ذلت دلا دے
کوئی اِن کی سوئی ہوئی دُم ہلا دے

....

بول..........

بول، کہ لب آزاد ہیں تیرے
بول، زباں اب تک تیری ہے
تیرا ستواں جسم ہے تیرا
بول، کہ جاں اب تک تیری ہے
دیکھ کہ آہنگر کی دکاں میں
تند ہیں شعلے، سرخ ہے آہن

کھلنے لگے قفلوں کے دہانے
پھیلا ہر اک زنجیر کا دامن
بول، یہ تھوڑا وقت بہت ہے
جسم و زباں کی موت سے پہلے
بول، کہ سچ زندہ ہے اب تک
بول، جو کچھ کہنا ہے کہہ لے

....

غزل

پھر لوٹا ہے خورشیدِ جہاں تاب سفر سے
پھر نورِ سحر دست و گریباں ہے سحر سے

پھر آگ بھڑکنے لگی ہر سازِ طرب میں
پھر شعلے لپکنے لگے ہر دیدۂ تر سے

پھر نکلا ہے دیوانہ کوئی پھونک کے گھر کو
کچھ کہتی ہے ہر راہ ہر اک راہ گزر سے

وہ رنگ ہے امسال گلستاں کی فضا کا

اوجھل ہوئی دیوارِ قفس حدِّ نظر سے

ساغر تو کھنکتے ہیں شراب آئے نہ آئے

بادل تو گرجتے ہیں گھٹا برسے نہ برسے

پاپوش کی کیا فکر ہے، دستار سنبھالو

پایاب ہے جو موج گزر جائے گی سر سے

⁘...........⁘

اقبال

آیا ہمارے دیس میں اک خوش نوا فقیر
آیا اور اپنی دھن میں غزلخواں گزر گیا
سنسان راہیں خلق سے آباد ہو گئیں
ویران میکدوں کا نصیبہ سنور گیا
تھیں چند ہی نگاہیں جو اس تک پہنچ سکیں
پر اس کا گیت سب کے دلوں میں اُتر گیا

اب دُور جا چکا ہے وہ شاہِ گدا نما
اور پھر سے اپنے دیس کی راہیں اُداس ہیں

چند اک کو یاد ہے کوئی اس کی ادائے خاص

دو اک نگاہیں چند عزیزوں کے پاس ہیں

پر اس کا گیت سب کے دلوں میں مقیم ہے

اور اس کی لے سے سیکڑوں لذت شناس ہیں

اِس گیت کے تمام محاسن ہیں لازوال

اِس کا وفور، اس کا خروش، اِسکا سوز و ساز

یہ گیت مثلِ شعلۂ جوّالہ تند و تیز

اس کی لپک سے بادِ صبا کا جگر گداز

جیسے چراغ وحشتِ صرصر سے بے خطر

یا شمعِ بزم صبح کی آمد سے بے نیاز

....

غزل

کئی بار اس کا دامن بھر دیا حُسن دو عالم سے
مگر دل ہے کہ اس کی خانہ ویرانی نہیں جاتی
کئی بار اس کی خاطر ذرّے ذرّے کا جگر چیرا
مگر یہ چشمِ حیران، جس کی حیرانی نہیں جاتی
نہیں جاتی متاعِ لعل و گوہر کی گراں یابی
متاعِ غیرت و ایماں کی ارزانی نہیں جاتی

مری چشمِ تن آساں کو بصیرت مل گئی جب سے
بہت جانی ہوئی صورت بھی پہچانی نہیں جاتی

سر خسرو سے نازِ کج کلاہی چھن بھی جاتا ہے
کلاہِ خسروی سے بوئے سلطانی نہیں جاتی

بجز دیوانگی واں اور چارہ ہی کہو کیا ہے؟
جہاں عقل و خرد کی ایک بھی مانی نہیں جاتی؟

⁘........⁘........⁘

موضوعِ سخن

گُل ہوئی جاتی ہے افسردہ، سلگتی ہوئی شام
ڈھل کے نکلے گی ابھی چشمۂ مہتاب سے رات
اور مشتاق نگاہوں کی سُنی جائے گی
اور اُن ہاتھوں سے مس ہوں گے یہ ترسے ہوئے ہات
اُن کا آنچل ہے، کہ رخسار، کہ پیراہن ہے!
کچھ تو ہے جس سے ہوئی جاتی ہے چلمن رنگیں

جانے اُس زلف کی موہوم گھنی چھاؤں میں

ٹمٹماتا ہے وہ آویزہ ابھی تک کہ نہیں

آج پھر حسنِ دلآرا کی وہی دھج ہوگی

وہی خوابیدہ سی آنکھیں، وہی کاجل کی لکیر

رنگِ رخسار پہ ہلکا سا وہ غازے کا غبار

صندلی ہاتھ پہ دھندلی سی حنا کی تحریر

اپنے افکار کی، اشعار کی دنیا ہے یہی

جانِ مضموں ہے یہی، شاہدِ معنی ہے یہی

⁘ . . . . ⁘
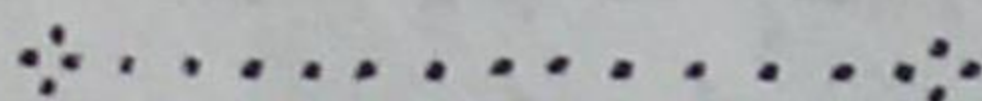
آج تک سُرخ وسیہ صدیوں کے سائے کے تلے
آدم وحوّا کی اولاد پہ کیا گزری ہے؟
موت اور زیست کی روزانہ صف آرائی میں
ہم پہ کیا گزرے گی، اجداد پہ کیا گزری ہے؟

ان دمکتے ہوئے شہروں کی فراواں مخلوق
کیوں فقط مرنے کی حسرت میں جیا کرتی ہے؟
یہ حسیں کھیت، پھٹا پڑتا ہے جوبن جن کا
کس لیے ان میں فقط بھوک اُگا کرتی ہے؟

یہ ہر اک سمت پُر اسرار کڑی دیواریں
جل بُجھے جن میں ہزاروں کی جوانی کے چراغ
یہ ہر اک گام پہ اُن خوابوں کی مقتل گاہیں
جن کے پرتو سے چراغاں ہیں ہزاروں کے دماغ

یہ بھی ہیں ایسے کئی اور بھی مضموں ہوں گے
لیکن اُس شوخ کے آہستہ سے کھلتے ہوئے ہونٹ
ہائے اس جسم کے کم بخت دل آویز خطوط!
آپ ہی کہیے کہیں ایسے بھی افسوں ہونگے
اپنا موضوعِ سخن ان کے سوا اور نہیں!
طبعِ شاعر کا وطن ان کے سوا اور نہیں

....

ہم لوگ

دل کے ایواں میں لیے گل شدہ شمعوں کی قطار
نورِ خورشید سے سہمے ہوئے اکتائے ہوئے
حُسنِ محبوب کے سیّال تصور کی طرح
اپنی تاریکی کو بھینچے ہوئے، لپٹائے ہوئے

غائتِ سود و زیاں، صورتِ آغاز و مآل
وہی بے سود تجسس، وہی بے کار سوال

مضمحل ساعتِ امروز کی بے رنگی سے
یادِ ماضی سے غمیں، دہشتِ فردا سے نڈھال
تشنہ افکار جو تسکین نہیں پاتے ہیں،
سوختہ اشک جو آنکھوں میں نہیں آتے ہیں
اک کڑا درد کہ جو گیت میں ڈھلتا ہی نہیں
دل کے تاریک شگافوں سے نکلتا ہی نہیں
اور اک الجھی ہوئی موہوم سی درماں کی تلاش
دشت و زنداں کی ہوس، چاکِ گریباں کی تلاش

....

شاہراہ

ایک افسردہ شاہراہ ہے دراز
دُور اُفق پر نظر جمائے ہوئے
سرد مٹی پہ اپنے سینے کے
سُرمگیں حسن کو بچھائے ہوئے
جس طرح کوئی غم زدہ عورت
اپنے ویراں کدے میں محوِ خیال
وصلِ محبوب کے تصوّر میں
مُو بمُو چُور، عضو عضو نڈھال

....

سیاسی لیڈر کے نام

سالہا سال یہ بے آسرا، جکڑے ہوئے ہات
رات کے سخت و سیہ سینے میں پیوست رہے
جس طرح تِنکا سمندر سے ہو سرگرمِ ستیز
جس طرح تیتری، کہسار پہ یلغار کرے
اور اب رات کے سنگین و سیہ سینے میں
اتنے گھاؤ ہیں، کہ جس سمت نظر جاتی ہے
جا بجا نور نے اک جال سا بُن رکھا ہے
دور سے صبح کی دھڑکن کی صدا آتی ہے

تیرا سرمایہ، تری آس یہی ہات تو ہیں
اور کچھ ہے بھی ترے پاس؟ یہی ہات تو ہیں
تجھ کو منظور نہیں غلبۂ ظلمت لیکن
تجھ کو منظور ہے یہ ہاتھ قلم ہو جائیں
اور مشرق کی کمیں گہ میں دھڑکتا ہوا دن
رات کی آہنی میت کے تلے دب جائے!

....

اے دلِ بیتاب ٹھہر

تیرگی ہے کہ امنڈتی ہی چلی آتی ہے
شب کی رگ رگ سے لہو پھوٹ رہا ہو جیسے
چل رہی ہے کچھ اس انداز سے نبضِ ہستی
دونوں عالم کا نشہ ٹوٹ رہا ہو جیسے

رات کا گرم لہو اور بھی بہ جانے دو
یہی تاریکی تو ہے غازۂ رخسارِ سحر
صبح ہونے ہی کو ہے اے دلِ بیتاب ٹھہر

مطلق الحکم ہے شیرازۂ اسباب ابھی
بھی زنجیر چھنکتی ہے پسِ پردۂ ساز

لغزش پا میں ہے پابندیٔ آداب ابھی
ساغرِ ناب میں آنسو بھی ڈھلک جاتے ہیں

اپنے دیوانوں کو دیوانہ تو بن لینے دو
اپنے میخانوں کو میخانہ تو بن لینے دو
جلد یہ سطوتِ اسباب بھی اٹھ جائے گی
یہ گرانباریٔ آداب بھی اٹھ جائے گی
خواہ زنجیر چھنکتی ہی چھنکتی ہی رہے ،

:. . . . .:

مرے ہمدم، مرے دوست!

گر مجھے اس کا یقیں ہو، مرے ہمدم، مرے دوست
گر مجھے اس کا یقیں ہو کہ ترے دل کی تھکن،
تیری آنکھوں کی اُداسی، ترے سینے کی جلن
میری دلجوئی، مرے پیار سے مٹ جائے گی
گر مرا حرفِ تسلی وہ دوا ہو جس سے
جی اٹھے پھر ترا اجڑا ہوا بے نور دماغ

تیری پیشانی سے ڈھل جائیں، یہ تذلیل کے داغ
تیری مدقوق جوانی کو شفا ہو جائے
گر مجھے اس کا یقیں ہو، مرے بھائی، مرے دوست
میں تجھے بھینچ لوں سینے سے لگا لوں تجھ کو
روز و شب، شام و سحر میں تجھے بہلاتا رہوں
میں تجھے گیت سناتا رہوں، ہلکے، شیریں
آبشاروں کے، بہاروں کے، چمن زاروں کے گیت
آمدِ صبح کے، مہتاب کے، سیاروں کے گیت
تجھ سے میں حسن و محبت کے حکایات کہوں
کیسے مغرور حسیناؤں کے برفاب سے جسم
گرم ہاتھوں کی حرارت میں پگھل جاتے ہیں

کیسے اک چہرے کے ٹھہرے ہوئے مانوس نقوش
دیکھتے دیکھتے یک لخت بدل جاتے ہیں
کس طرح عارضِ محبوب کا شفاف بلور
یک بیک بادۂ احمر سے دہک جاتا ہے
کیسے جھکتی ہے سرِ شاخ سے خود برگِ گلاب
کس طرح رات کا ایوان مہک جاتا ہے
یوں ہی گاتا رہوں، گاتا رہوں، تیری خاطر
گیت بنتا رہوں، بیٹھا رہوں، تیری خاطر
پر مرے گیت ترے دکھ کا مداوا ہی نہیں
نغمہ جرّاح نہیں، مونس و غم خوار سہی
گیت نشتر تو نہیں، مرہم آزار سہی

تیرے آزار کا چارہ نہیں نشتر کے سوا
اور یہ سفّاک مسیحا مرے قبضے میں نہیں
اس جہاں کے کسی ذی روح کے قبضے میں نہیں
ہاں مگر تیرے سوا، تیرے سوا، تیرے سوا،

....

ترانہ

دربارِ وطن میں جب اک دن سب جانے والے جائیں گے
کچھ اپنی سزا کو پہنچیں گے کچھ اپنی جزا لے جائیں گے

اے خاک نشینو! اٹھ بیٹھو وہ وقت قریب آپہنچا ہے
جب تخت گرائے جائیں گے جب تاج اچھالے جائیں گے

اب ٹوٹ گریں گی زنجیریں اب زندانوں کی خیر نہیں
جو دریا جھوم کے اٹھے ہیں، تنکوں سے نہ ٹالے جائیں گے

کٹتے بھی چلو بڑھتے بھی چلو، بازو بھی بہت ہیں، سر بھی بہت
چلتے بھی چلو کہ اب ڈیرے منزل ہی پہ ڈالے جائیں گے

اے ظلم کے ماتو لب کھولو، چپ رہنے والو چپ کب تک
کچھ حشر تو ان سے اٹھے گا، کچھ دور تو نالے جائیں گے

ختم شد

کتبہ: لعل محمد خاں